علامہ فضل امام اور اُن کی مشہور زمانہ تصنیف

"مرقات"

ڈاکٹر غلام یحییٰ انجم، استاذ شعبہ دینیات، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

ہندوستان میں معقولات کے جتنے سلسلے چلے ہیں سب کا بانی محقق جلال الدین دوانی (م ۹۱۸ھ) کو کہا جاتا ہے۔ یہ دوسرے بزرگ ہیں جن کے علم و فن کا اعتراف قوم نے انہیں "محقق" کے خطاب سے نوازا ہے آج ہندوستان میں جتنی معقولاتی سرگرمیاں نظر آرہی ہیں سب انھیں کی رہین منت ہیں۔

محقق دوانی شاگرد تھے مولانا محی الدین گوشہ کفاری اور خواجہ حسن شاہ بقال کے۔(۱) اور یہ دونوں فاضل شاگرد تھے میر سید شریف جرجانی (م ۸۱۶ھ) کے جو شاگرد تھے محمد بن مبارک شاہ منطقی کے اور یہ شاگرد تھے قطب الدین رازی (م ۷۶۶ھ) کے (۲) اور قطب الدین رازی شاگرد تھے قطب الدین شیرازی (م ۷۱۰ھ) کے (۳) اور یہ بزرگ شاگرد تھے محقق طوسی خواجہ نصیر الدین (م ۶۷۲ھ) کے محقق طوسی کی وساطت سے(۴) شیخ بوعلی سینا (م ۴۲۸ھ) تک اور شیخ کے توسط سے فارابی (م ۳۳۹ھ) تک اور فارابی کے توسط سے مدرسہ اسکندریہ کے فلاسفہ کے معلمین اور ان کے ذریعہ ارسطو (۳۸۴ - ۳۲۲ ق م) تک پہنچا ہے۔

لیکن برصغیر خاص طور سے ہندوستان والوں کے لئے محقق دوانی کی ذات

معقولات کے لئے مانند آفتاب تھی جس کی کرنیں متعدد سمت پھیلیں اور کئی سلسلے وجود میں آئے مگر چار ان میں سب سے اہم ہیں جنہیں کافی فروغ ہوا۔

محقق دوانی کے شاگرد خواجہ جمال الدین محمود شیرازی تھے جن کے شاگرد تھے ایک مرزا جان شیرازی (۵) اور دوسرے میر فتح اللہ شیرازی (م ۹۹۷ھ)(۶) اول الذکر کے شاگرد ملا یوسف کوسج شیرازی تھے (۷) اور ان دونوں بزرگوں کے شاگرد ملا محمد فاضل بدخشی (۸) اور ان کے شاگرد میر زاہد ہروی (م ۱۱۰۱ھ)(۹) ان کے شاگرد شاہ عبدالرحیم (م ۱۱۳۱ھ)(۱۰) پدر بزرگوار شاہ ولی اللہ ان کے شاگرد شاہ ولی اللہ دہلوی (م ۱۱۷۶ھ)(۱۱) ان کے شاگرد شاہ عبدالعزیز (م ۱۲۳۹ھ)(۱۲) جن سے سلسلہ تلمذ میں سہارنپور اور مغربی ہندوستان کے علماء منسلک ہیں۔

ثانی الذکر یعنی میر فتح اللہ شیرازی پہلے دکن آئے پھر وہاں سے اکبر کی طلب پر شمالی ہندوستان آئے جہاں دیگر شاگردوں کے علاوہ ملا عبدالسلام لاہوری (م ۱۰۲۷ھ) نے ان سے مل کر کسب علم کیا (۱۳) ملا عبدالسلام لاہوری کے شاگرد ملا عبدالسلام دیوی تھے (۱۴) ان کے شاگرد دانیال چوراسی و امان اللہ بنارسی (م ۱۱۳۳ھ) اور ان کے شاگرد ملا قطب الدین شہید سہالوی (م ۱۰۳ھ)(۱۵) اور ان کے شاگرد ان کے صاحبزادے ملا نظام الدین سہالوی (م ۱۱۶۱ھ) تھے (۱۶) جن کے سلسلے سے علمائے پورب بالخصوص فضلائے فرنگی محل منسلک ہیں۔

ملا نظام الدین سہالوی کے شاگرد تھے۔ ملا کمال الدین سہالوی (۱۷) (م ۱۱۷۵ھ) اور ان کے شاگرد تھے ملا محمد اعلم سندیلوی (م ۱۱۸۹ھ)(۱۸) اور ان کے شاگرد تھے۔ مولانا عبدالواجد کرمانی خیرآبادی (م ۱۲۱۸ھ)(۱۹) اور پھر ان سے صاحب تذکرہ امام المعقولات علامہ فضل امام خیرآبادی نے کسب فیض کیا۔ اس طرح معقولات میں ان کا سلسلہ دس واسطوں سے میر فتح اللہ شیرازی تک اور محقق دوانی سے ہوتے ہوئے

ارسطو تک پہنچتا ہے جبکہ منقولات میں سولہ واسطوں سے ابو عبداللہ محمد بن اسمٰعیل بن ابراہیم بخاری (م ۲۵۶ھ) تک پہنچ جاتا ہے۔

تعلیمی اعتبار سے اساتذہ اور استاذالاساتذہ کا زریں سلسلہ ہے خاندانی اعتبار سے ان کا سلسلہ نسب گرامی اکتیس واسطوں سے خلیفہ ثانی فاروق اعظم عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ تک پہنچتا ہے۔ اس طرح فضل امام کی حیثیت ہر لحاظ سے قابل قدر ہے۔

فضل امام کے نام میں کچھ ایسی تاثیر ہے کہ خدا کے فضل سے ان کی امامت ہر میدان میں مسلم رہی معقولات میں خاص طور سے ذروۂ فضل و کمال پر پہنچے ہوئے تھے اپنے زمانہ میں معقولات میں یکتا و یگانہ سمجھے جاتے تھے جس سرزمین پر انہوں نے آنکھیں کھولی تھیں اس دور میں وہاں ارباب فضل و کمال کا غلغلہ تھا ہر فن کے ماہرین اس چھوٹے سے قصبے میں جسے دنیا خیرآباد کہتی ہے پائے جاتے تھے۔

خیرآباد اگرچہ چھوٹا قصبہ ہے مگر اودھ کے قصبات میں امتیازی حیثیت کا مالک ہے۔ اس قصبہ کی تاریخ بہت پرانی ہے تلاش و جستجو سے انکشاف ہوا ہے۔ کہ راجہ بکرما جیت کے دور سے قبل یہاں آبادی تھی۔ اس کا نام "چتررسیق" تھا پھر راجہ بکرما جیت کے عہد میں "منساوی" کی مناسبت سے "منساچتر" کے نام سے موسوم ہوا۔

عہد اسلامی میں سب سے پہلے حضرت یوسف خاں رازی رحمۃ اللہ علیہ اپنے رفقا کے ساتھ تشریف لائے۔ آپ کی آخری آرام گاہ یہیں ہے خیرآباد کے اس وقت کے حالات پردۂ خفا میں ہیں۔ لیکن بدایونی نے منتخب التواریخ میں لکھا ہے کہ اس قصبہ کو سلطان ابراہیم بن مسعود بن محمود نے آباد کیا تھا۔

"و چند بنا فرمود از آنجملہ خیرآباد و آباد و غیرہ ذالک و اورا سید السلاطین

(وحشت نامہ ص ۲۰)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے پہلے اس آبادی کا کوئی نظم و نسق نہیں تھا۔ سلطان ابراہیم نے پوری توجہ صرف کرکے اسے باقاعدہ آباد کیا اور اغلب خیال ہے کہ اس وقت سے اس کا نام خیرآباد ہوئی۔ بعض لوگوں نے اس نام کی نسبت حضرت شاہ خیرالدین یا کھیر پاسی علیہ الرحمہ کی طرف کی ہے۔ نجم الحسن رضوی نے اس خیال کی تردید کی ہے اور لکھا ہے کہ اس قصبہ کی نسبت ان بزرگ کی طرف بے بنیاد ہے۔

یہ قصبہ "سیتاپور" سے چار میل کے فاصلے پر جانب مشرق اور لکھنؤ سے ۵۴ میل کی مسافت پر مغرب میں صوبائی شاہراہ پر واقع ہے اس کے شمال "سیتاپور" اور "بسواں" کے درمیان پختہ سڑک ہے اور "مچھریٹہ" کو بھی یہاں سے سڑک گئی ہے۔ اس شہر کا طول البلاد درجہ ۸۰ دقیقہ ۴۱ اور عرض البلاد درجہ ۲۷ دقیقہ ۳۳ ہے۔ (۲۱)

مولانا فضل امام کے والد ماجد شیخ محمد ارشد "پرگام" کے متوطن تھے۔ اُن کے آباء و اجداد کی مستقل سکونت وہیں رہی لیکن نہ جانے کس وجہ سے شیخ محمد ارشد پرگام سے ترک وطن کرکے خیرآباد آ گئے۔ اور پھر ہمیشہ کے لئے یہیں کے ہو رہے فضل امام کی پیدائش خیرآباد میں ہوئی۔ ان کی تاریخ ولادت سے متعلق تمام مورخین خاموش ہیں جب کہ تاریخ وفات کے بارے میں جتنے منہ اتنی ہی باتیں ہیں۔ نجم الحسن رضوی نے ۱۲۴۴ھ تاریخ وفات لکھی ہے۔ (۲۲) جب کہ صاحب تذکرۃ المصنفین حبیب الرحمن خیرآبادی (۲۳) اور تذکرہ علماء ہند کے مصنف نے ۱۲۴۳ھ تاریخ وفات بتائی ہے۔ حالانکہ سرسید آثار الصنادید (۲۴) میں اور بشیرالدین واقعات دارالحکومت دہلی میں سنہ وفات ۱۲۴۴ھ لکھتے (۲۵) ہیں۔ [illegible] کیونکہ غالب کے تاریخی قطعہ سے بھی یہی سنہ برآمد ہوتا ہے جو [illegible] کے وقت کہا تھا۔

اے دریغا قبلۂ ارباب فضل | کرد سوئے جنت الماوی خرام
کار آگاہی ز پرکار اوفتاد | گشت دار الملک معنی بی نظام
چوں ارادت از پئے کسب شرف | جست سال فوت آں عالی مقام
چہرۂ ہستی خراشیدم نخست | تا بنائے تخرجہ گردد تمام
گفتم اندر سایۂ لطف نبی | باد آرامش گہہ فضل امام(۲۶)

غالب نے اس قطعہ میں فن تاریخ گوئی کی ایک صنعت "تخرجہ" سے امام فضل و کمال کی تاریخ نکالی ہے اور وہ اس طرح کہ "ہستی" کے چہرہ یعنی "ہ" سے عدد ۵ کی تخریج کی، پھر اس کو "سایہ لطف نبی" کے اعداد ۲۵۷ اور فضل امام کے عدد ۹۹۲ کے جوڑ ۱۲۴۹ سے گھٹا دیا اس طرح سنہ وفات ۱۲۴۴ھ نکل آیا ـ

فضل امام نے جن جن اساتذہ سے کسب فیض کیا ان کی صراحت نہیں ملتی لیکن مولانا مفتی عبد الواجد خیر آبادی جو اپنے زمانے کے جلیل القدر علمار میں شمار کئے جاتے تھے ان کے ارشد تلامذہ میں سے تھے ـ غالب گمان یہی ہے کہ منقولات و معقولات کی درسیات کی تمام تعلیم ان ہی کے زیر سایہ ہوئی ـ صاحب نزہۃ الخواطر نے مفتی عبد الواجد کرمانی کو "احد فحول العلمار"(۲۷) لکھا ہے ـ جب کہ رحمان علی کا کہنا ہے کہ "طبع و ذہن کے اعتبار سے متار الیہ کی مثل تھے"(۲۸) مفتی موصوف مولانا محمد اعلم سندیلوی کے بھانجے تھے ـ درس و تدریس کا فریضہ خیر آباد میں انجام دیا مگر افتاء کے منصب پر لکھنؤ میں مامور تھے ـ

مولانا فضل امام تمام مدت تعلیم انہی سے وابستہ رہے اور انھوں نے اپنے فیض خاص سے فضل امام کو ایسا سنوار دیا کہ فضل امام "امام فضل و کمال" بن گئے ـ اگر ایک طرف شاہ عبد العزیز محدث دہلوی علم منقولات کا دریا بہا رہے تھے تو دوسری طرف فضل امام معقولات کے نیر تاباں بن کر اپنی کرنیں بکھیر رہے تھے ـ یہ اسی تابندگی کا نتیجہ تھا کہ جس

بھی پر اس فضل و کمال کے نیر تاباں کی کرنیں وہ اپنے زمانے کا روشن ستارہ بن کر چمکا۔ شاہ غوث علی (م ۱۲۹۸ھ) جن کی زندگی سیاحت میں بسر ہوئی فرماتے ہیں۔

مولوی محمد اسمٰعیل صاحب سے ایک سبق کافیہ کا اور مولوی شاہ محمد اسحٰق صاحب سے اور مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب سے حدیث شریف پڑھی باقی کتابیں مولوی فضل امام خیرآبادی سے پڑھیں۔ یہ مرحوم و مغفور ہمارے حال پر نہایت شفقت فرماتے تھے (۲۹)

دوسرے شاگرد خود آپ کے فرزند ارجمند بطل حریت مجاہد اعظم علامہ فضل حق (م ۱۲۷۸ھ) (۳۰) جنہوں نے اپنی صلاحیت کا ارباب کمال سے لوہا منوایا اور صدر الصدوری کے منصب پر ایک عرصہ تک فائز رہے۔

تیسرے شاگرد مفتی صدرالدین آزردہ (م ۱۲۸۵ھ) جن کے علم و فضل کا خطبہ آج بھی اہل علم کی انجمنوں میں پڑھا جاتا ہے۔ یہ بھی صدر الصدوری کے منصب پر مامور رہے۔ (۳۱)

علامہ فضل امام کے فضل و کمال کا اعتراف ملک کے اکثر و بیشتر دانشوروں نے کیا ہے سرسید ان سے متعلق۔

"اکمل فرد نوعِ انسی، مہبط انوار فیوض قدسی، قدوۂ علمائے فحول، حاوی معقول و منقول، واسطۃ العقد، سلسلہ حکمت اشراقی و مشائی"

ان جیسے بیسیوں القاب لکھنے کے بعد رقمطراز ہیں۔

"مجال نہیں کہ آپ کے اوصاف حمیدہ اور محامد پسندیدہ تقریر کر سکے اگر ہزار برس مشق سخن کرے اور اسی ذکر میں زبان سخن سنجی سے معاف نہ رکھے یقین ہے کہ ہزار سے ایک ادا ہو سکے علوم عقلیہ اور فنون حکمیہ کو ان کی طبع وقار سے اعتبار تھا اور علوم ادبیہ کو ان کی زبان دانی سے افتخار ان کا ذہن رسا دلائل

قطعیہ کو بیان کرنا فلسفہ کو معقول نہ کہتے اور اگر ان کا فکر صائب بنیاد سے طوق قائم نہ کرتا اشکال ہندسہ تار عنکبوت سے سست تر نظر آتیں۔ (۳۲)

مولانا عبدالحی بھی ان کی منطقی بصیرت کے معترف ہیں لکھتے ہیں۔

"انفرد بالامامة فی صناعة المیزان والحکمة فی عصره ولم یبان عدفی ذلک احد من نظرائه" (۳۳)

وہ علم و حکمت اور منطق میں اپنے زمانے کے امام تھے۔ اس فن میں ان کی کوئی مثال نہ تھی۔

مولانا نجم الحسن رضوی نے علامہ فضل امام کو معقولات ہی کا صرف نہیں بلکہ اقلیم علوم کا انہیں تاجدار کہا ہے۔ لکھتے ہیں۔

"مولانا فضل امام اقلیم علوم کے تاجدار اور میدان تحقیق و تدقیق کے شہ سوار تھے۔" (۳۴)

واقعات دارالحکومت دہلی میں بشیر الدین نے ان کے علمی کمالات کا اعتراف کیا ہے اور ساتھ ہی ان کی خوش خلقی اور حلم و بردباری کا ذکر کرکے انہیں افضل ترین لوگوں میں شمار کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

"آپ علوم عقلیہ و فنون حکمیہ و علوم ادبیہ کے بحر ذخار تھے۔ باوجود ان کمالات کے خلق و حلم کا کچھ حساب نہ تھا۔ ہمیشہ سرکار کی حکام کے وقت میں مناصب بلندہ سے سرفراز ابنائے عہد سے ممتاز ہے۔ پایہ ہمت آپ کا بلند تھا اور سلوک آپ کا حق پسند بسبب خلق وسیع کے ہر عاجز زلوں کی مدد کرتے۔" (۳۵)

بشیر الدین کی اس عبارت سے اگر ایک طرف علامہ کی علمی دسترس اور منطقی

ر و ادراک کا اندازہ ہوتا ہے۔ تو دوسری طرف علم و بردباری، غربا نوازی اور حسن اخلاق کے ذکر سے ایک اچھا انسان ہونے کی طرف اشارہ ملتا ہے۔

علامہ کا یہ برتاؤ سب کے ساتھ یکساں تھا۔ شاگردوں کے ساتھ بھی بڑی نرم ی اور انس و محبت کے ساتھ پیش آتے تھے علمی کشش تو تھی ہی اس سے کہیں زیادہ کشش آپ کے مخلصانہ برتاؤ میں تھی۔ اس کی وضاحت مذکورہ بالا عبارت سے ہو جاتی مگر اس قول کی تائید اس سے کہیں زیادہ اس واقعہ سے ہوجاتی ہے جسے صاحب تذکرہ تیہ نے درج کیا ہے۔

"مولوی فضل امام صاحب نے ایک طالب علم کو فرمایا کہ جاؤ فضل حق سے سبق پڑھ لو۔ وہ آیا۔ غریب آدمی، بدصورت عمر زیادہ، علم کم، ذہن کند یہ نازک طبع، ناز پرور دہ جمال صورت و معنی سے آراستہ بیس برس کا سن و سال، نئی فضیلت، ذہن میں جودت بھلا میل ملے تو کیسے ملے اور صحبت راس آئے تو کیوں کر تھوڑا سبق پڑھایا تھا کہ بگڑ گئے جھٹ اس کی کتاب پھینک دی، اور برا بھلا کہہ کر نکال دیا، وہ روتا ہوا مولانا صاحب کی خدمت میں پہنچا اور سارا حال بیان کیا، فرمایا کہ بلاؤ اسے، مولوی فضل حق صاحب آئے اور دست بستہ کھڑے ہو گئے مولانا صاحب نے ایک تھپڑ دیا اس زور سے کہ ان کی دستار فضیلت دور جا پڑی۔ اور فرمایا کہ تو تمام عمر بسم اللہ کی گنبد میں رہا ناز و نعمت میں پرورش پائی جس کے سامنے کتاب رکھی اس نے خاطر داری سے پڑھایا طالب علموں کی قدر تو کیا جانے اگر مسافرت کرتا، بھیک مانگتا اور طالب علم بنتا تو حقیقت معلوم ہوتی، ارے طالب علم

کیا قدر ہم سے پوچھ۔

درازی شب از مژگان من پرس
کہ یک دم خواب در چشمم نہ گشت است

عزیزو! تم جانو گے اگر آئندہ ہمارے طالب علموں کو کچھ کہا یہ چپ ہو کر روتے رہے کچھ دم نہ مارا غیر قصہ رفع دفع ہوا لیکن پھر کبھی کسی طالب علم کو کچھ نہ کہا۔ (۳۶)

اس واقعہ سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ علامہ فضل امام واقعتاً مخلص انسان تھے۔ شاگردوں کا خاص خیال رکھا کرتے تھے۔ ان کی قدر شناسی اپنا اوّلین فرض تصوّر کرنے زمانہ اور اہلِ زمانہ کے چنگل میں نہ آ کر اسلام اور اہلِ اسلام کے دامن سے وابستہ رہ کر اشاعتِ دینِ حق کرتے رہے۔

علامہ فضل امام درس و تدریس کی مشغولیت کے علاوہ ہندوستان میں عظیم منصب پر بھی فائز تھے۔ اس زمانے میں علماء کو حکومت برطانیہ کی جانب سے دیا جانے والا سب سے معزز اور بڑا عہدہ "صدر الصدوری" کا تھا علامہ اس پر فائز تھے۔ رحمٰن علی نے لکھا ہے۔

دہلی میں صدر الصدوری کے عہدہ پر انگریزی سرکار کی طرف سے ممتاز تھے۔ (۳۷)
مگر تذکرہ علمائے ہند کے مترجم پروفیسر محمد ایوب قادری نے لکھا ہے کہ انھیں یہ منصب براہِ راست نہیں ملا بلکہ:۔

"فراغ علم کے بعد دہلی پہنچے انگریزی حکومت کی طرف سے پہلے دہلی کے مفتی پھر صدر الصدور مقرر ہوئے۔" (۳۸)

اس منصب پر مامور ہونے کے بعد ان کی عظمت اور جلالت قدر میں چار چاند لگ گئے اور اس زمانہ میں

میں ان کی ایک نمایاں حیثیت ہو گئی۔ واقعات دارالحکومت دہلی کے مصنف نے اس کا اعتراف اس طرح کیا ہے۔

" سرکاری حکام وقت میں مناصب بلند سے سرفراز اور اپنا ئے عہدے ممتاز رہے " (۳۹)

نجم الحسن خیرآبادی نے لکھا ہے کہ مولانا فضل امام اس منصب پر ایک عرصہ تک صدرالصدور رہے۔ (۴۰)

مولانا جب تک اس منصب پر رہے بڑے تزک و احتشام کے ساتھ رہے اور اس سے سبکدوشی کے بعد بھی ذرہ برابر عزت و وقار میں فرق نہ آیا بشیر الدین احمد کے لکھنے کے مطابق آپ کا شمار شاہ جہاں آباد کے رؤسا میں ہوتا تھا (۴۱) اس منصب سے سبکدوشی کے بعد پٹیالہ چلے گئے جہاں کچھ عرصہ قیام رہا پھر وطن مالوف خیرآباد تشریف لے آئے۔ مورخین نے لکھا ہے کہ وہ کلکتہ بھی تشریف لے گئے دو ایک واقعات سے ان کے کلکتہ جانے کا ثبوت ملتا ہے۔ (۴۲) مگر یہ پردہ خفا میں ہے کہ کلکتہ دہلی سے گئے تھے یا پٹیالہ (پنجاب) سے غالب گمان یہی ہے کہ وہ کلکتہ دہلی سے گئے تھے۔ کیونکہ شاہ غوث علی کے بیان سے مترشح ہوتا ہے وہ فرماتے ہیں۔

ہم ان کے ساتھ پٹیالہ گئے۔ اور ضروری کتب دینیہ اور منطق پڑھتے رہے جب وہ عالم قدس کو رحلت فرما چکے تو نہایت رنج ہوا۔ اس دن سے کتابیں بالائے طاق رکھ دیں کہ اس شفقت سے نہ کوئی پڑھائے گا اور نہ ہم پڑھیں گے۔ (۴۳)

اگرچہ اس میں وضاحت نہیں ہے کہ مولانا پٹیالہ سے اپنے وطن خیرآباد کب تشریف لائے لیکن اتنا ضرور معلوم [illegible] ہوتا ہے کہ شاہ غوث علی تمام مدت تعلیم ان سے وابستہ رہ کر پٹیالہ میں [illegible] حقیقت واقعہ کچھ بھی ہو اتنا طے ہے کہ [illegible] کیا۔

وطن مالوف خیرآباد کر رحلت فرمائی، اور شیخ سعد الدین خیرآبادی کی درگاہ کے احاطہ میں مغرب کی جانب اپنے استاد مولانا محمد اعلم سندیلوی اور مولانا عبدالواجد خیرآبادی کے قریب مدفون ہوئے۔

علامہ ایک متدین خانوادے کے چشم و چراغ تھے ان کے والد شیخ محمد ارشد فرشتہ صفت انسان تھے اور مولانا احمد اللہ بن حاجی صفت اللہ محدث خیرآبادی سے بیعت تھے علامہ فضل امام کو بھی منطق و فلسفہ میں اس قدر انہماک کے ساتھ ساتھ تصوف سے بھی کافی لگاؤ تھا۔ مولانا شاہ صلاح الدین گوپامؤی سے بیعت اور اجازت وخلافت حاصل تھی شاہ صلاح الدین مولانا محمد اعظم سندیلوی کے تلمیذ ارشد اور مولانا شاہ قدرت اللہ کے مرید وخلیفہ تھے۔

علامہ فضل امام مسند درس بچھانے کے علاوہ کاغذ و قلم کے بھی شہنشاہ رہے ہیں معقولات میں ان کے متعدد شروح و حواشی ملتے ہیں۔ تاریخ نویسی کا بھی انھوں نے فریضہ انجام دیا ہے۔ تقریباً دو درجن کتابوں کے مصنف ہیں جن میں اکثر کتابیں دست برد زمانہ کا شکار ہوگئی ہیں اور جو ہیں ان میں اکثر زیور طبع سے آراستہ نہ ہوسکی ہیں۔ ان کی شہرۂ آفاق تصنیف "مرقات" ہے جو متعدد بار چھپی ہے۔ مصنف کی وہ کتابیں جو دستیاب ہیں ذیل میں ان کا تعارف مختصراً پیش کیا جا رہا ہے۔

(۱)۔ تشحیذ الاذہان فی شرح المیزان :۔

یہ کتاب میزان المنطق کی شرح ہے۔ اس کا مطبوعہ نسخہ نظر سے نہیں گزرا ہے البتہ اس کا غیر مطبوعہ قلمی نسخہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ذخیرۂ سلیمان میں ۲۵۲/۹ نمبر کے تحت محفوظ ہے جو متوسط تقطیع میں ۱۶۳ صفحات پر مشتمل ہے۔

(۲) تلخیص الشفاء :۔

شیخ الرئیس بو علی سینا کی مشہور زمانہ تصنیف طبیعات الشفاء کا خلاصہ ہے اس کا ایک قلمی نسخہ علامہ کے دست مبارک کا تحریر کردہ آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے سبحان اللہ کلکشن میں ۱۱۸/۳۲ نمبر کے تحت محفوظ ہے یہ قلمی نادر نسخہ متوسط تقطیع میں ۳۴۸ صفحات پر مشتمل ہے۔

۳:۔ حاشیہ میر زاہد رسالہ :۔

قطب الدین شیرازی نے تصوّر و تصدیق کے عنوان سے ایک رسالہ لکھا میر زاہد ہروی نے اس پر ایک شرح لکھی جو میر زاہد رسالہ یا قطبیہ کے مشہور ہوئی علامہ نے اسی شرح پر ایک حاشیہ لکھا یہ حاشیہ طبع ہو چکا ہے۔

۱۲۳۳ھ کا لکھا ہوا اس حاشیہ کا قلمی نسخہ ذخیرہ شیفتہ میں ۱۶۰/۱۵۴ نمبر کے تحت علی گڈھ مسلم یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ ہے۔

۴:۔ حاشیہ میر زاہد ملا جلال :۔

علامہ سعد الدین تفتازانی (م ۷۹۴ھ) نے "تہذیب المنطق والکلام" نامی متن لکھا تھا۔ اس متن کے حصہ اوّل یعنی تہذیب المنطق کی شرح محقق دوانی جلال الدین نے شرح التہذیب کے نام سے لکھی میر زاہد ہروی نے اس کے دیباچے پر حاشیہ لکھا جو میر زاہد ملا جلال سے مشہور ہے علامہ فضل امام نے اس حاشیہ پر ایک وقیع حاشیہ لکھا یہ حاشیہ ابھی غیر مطبوعہ ہے ۱۲۳۳ھ میں امانت علی خورجوی کے ہاتھ کا لکھا ہوا بخط شکستہ ما یقرأ مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے نوادر قلمی میں محفوظ ہے۔

۵:۔ مقدمہ تاریخ یا خلاصۃ التاریخ :۔ (فارسی)

یہ کتاب فن تاریخ و سیر میں ہے اور چھ سو صفحات پر مشتمل ہے اس کتاب کے تین نسخوں کا علم ہو سکا ہے ایک نسخہ عجائب گھر لائبریری لاہور میں [illegible] محفوظ ہے یہ نسخہ ۳۶۹ اوراق پر مشتمل ہے۔ اور خوشخط لکھا ہوا ہے اس نسخہ پر کتاب کا نام "مقدمہ تاریخ" لکھا ہوا ہے۔ دوسرا نسخہ مرکز تحقیقات فارسی ایران و پاکستان کے کتاب خانہ گنج بخش راولپنڈی میں ہے۔ اس پر اس کتاب کا نام "خلاصۃ التواریخ" لکھا ہے، تیسرا نسخہ رضا لائبریری رام پور میں ہے۔

یہ کتاب علامہ فضل امام نے [illegible] میں قیام دہلی کے دوران لکھی ہے تاریخ عالم پر مشتمل ہے۔ جس کی ابتدا حضرت سیدنا آدم علیہ السلام سے کی گئی ہے جب کہ اختتام ہفت اقلیم کے بلاد اور عجائب کے بیان پر ہے۔

۱۶:- آمد نامہ:-

یہ کتاب بھی علامہ کی اہم تصانیف میں سے ایک ہے اس کتاب کے مطالعہ سے علامہ کی فارسی زبان پر قدرت و مہارت کا اندازہ ہوتا ہے اس میں کل نو ابواب ہیں اس کا ایک باب علماء و فضلاء کے حالات پر مشتمل ہے جو تراجم الفضلاء کے نام سے انگریزی ترجمہ و حواشی کے ساتھ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کراچی سے ۱۹۵۶ء میں شائع ہو چکا ہے اس کا قلمی نسخہ سید ولایت احمد سجادہ نشین آستانہ قلندریہ لاہر پور کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

۱۷:- نخبۃ السیر:-

اس کتاب کا قلمی نسخہ صاحبزادہ عبید اللہ خاں رئیس ٹونک کے کتب خانہ میں ہے۔

۸۔ حاشیہ افق المبین :۔

اس کتاب کا نسخہ مولوی احتشام الدین شہابی اکبرآبادی کے کتب خانہ میں ہے۔

۹۔ رسائل نحو :۔

نحو میں ایک رسالہ کا تذکرہ ملتا ہے یہ رسالہ دہلی یونیورسٹی کی لائبریری میں ہے

۱۰ مرقات :۔

علامہ فضل امام کی مشہور زمانہ تصنیف "مرقات" ہے یہ کتاب فن منطق میں ہے اور ایک عرصہ سے درس نظامی کے نصاب میں شامل ہے منطق میں ایسی جامع و مانع کتاب نظر سے نہیں گذری ہے جو اپنے اختصار کے ساتھ تمام منطقی اصطلاحات پر مشتمل ہو، یہ کتاب نجم الدین کاتبی قزوینی (م ۶۱۳ھ) کی "شمسیہ" اور علامہ سعدالدین تفتازانی کی "تہذیب التہذیب" کی طرز پر لکھی گئی ہے حبیب الرحمٰن خیرآبادی نے لکھا ہے۔

> مرقات فن منطق میں مبتدیوں کے لئے نہایت عمدہ کتاب ہے عبارت سہل سے سہل ہے۔ اور منطقی اصطلاحات کو بھی بہت آسان طریقے سے بلا قیل و قال کے سمجھایا گیا ہے .... اس کتاب سے معمولی طالب علم غیر معمولی فائدہ حاصل کرتے ہیں۔ (۴۶)

صاحب "نزہۃ الخواطر" نے مرقاۃ کو متن متین لکھا ہے۔

"ومن مصنفاته "المرقاة" في المنطق متن متين" (۴۷)

یہ کتاب خیر الکلام ما قل ودل کی واضح ترین مثال ہے منطق کے اکیس اصطلاحوں کو آسان لب و لہجہ میں سمیٹ کر سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے [illegible]

پرواکئے بغیر منطقی اصطلاحات کو آسان پیرایۂ بیان میں نمایاں کیا گیا ہے اس وجہ سے یہ کتاب مؤثر ہونے کے ساتھ دلچسپ ہو گئی ہے۔

اس کتاب کے نہ جانے کتنے ایڈیشن نکل چکے ہیں ہندوستان کے متعدد مدارس میں شامل نصاب ہے اس کی اسی افادیت کے پیش نظر اس کی عربی، فارسی اور اردو زبان میں متعدد شرحیں لکھی گئیں سب سے پہلے تو خود ان کے نبیرہ علامہ عبدالحق (م ۱۳۱۶ھ) نے عربی زبان میں ایک معرکۃ الآرا شرح لکھی، جو پاکستان سے شائع ہوتی ہے۔ ایک دوسری شرح فارسی زبان میں بھوپال سے شائع ہوئی۔ اس کتاب کا اردو ترجمہ دارالترجمہ، حیدرآباد سے شائع ہوا۔ اور پھر "معقات" اور "مرآۃ" کے نام سے دو شرحیں یکے بعد دیگرے علمائے دارالعلوم دیوبند کے تعلق سے منظر عام پر آئیں۔ اس کے علاوہ ایک مبسوط حاشیہ مولانا عبدالحکیم شرف قادری پاکستان کے قلم سے منظر عام پر آیا۔ ادھر حال میں مولانا نظام الدین گورکھپوری نے "مبرات" کے نام سے مرقات کی ایک معرکۃ الآرا شرح لکھی ہے جو طباعت کے مراحل سے گذر کر عنقریب منصۂ شہود پر آنے والی ہے۔

مرقات کے سبب تالیف اور اس کی اہمیت کو سمجھنے کے لئے اس پس منظر کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے جس کا اختصار ذیل میں دیا جا رہا ہے۔

منطق کو بحیثیت ایک علم کے ارسطو نے مدون کیا اس منطق کے افادات آٹھ کتابوں میں مرتب ہوئے

۱:۔ قاطیغوریاس۔	(کتاب المعقولات)
۲:۔ باری ارمینیاس۔	(کتاب العبارات)
۳:۔ انالوطیقا۔	(کتاب القیاس)
۴:۔ ابودقطیقا۔	(کتاب البرہان)

۵۔ طوبیقا (کتاب الجدل)
۶۔ سوفسطیقا (کتاب الحکمۃ المموھۃ)
۷۔ ریطوریقا۔ (کتاب الخطابت)
۸۔ بوطیقا۔ (کتاب الشعر)

بعد میں اس فن کی تسہیل کے لئے فرفوریوس نے علم منطق کا ایک مدخل لکھا جو ایساغوجی کے نام سے مشہور ہوا صاحب کشف الظنون نے لکھا ہے۔

"ایساغوجی یونانی لفظ ہے اس کے معنی کلیاتِ خمس کے ہیں اور یہ منطق کے نو ابواب میں سے ایک ہے"۔ کسی شاعر کا قول ہے۔

جنس و فصل و نوع و خاصہ عرض عام
جملہ را ایساغوجی کردند نام ..." (۴۸)

اس کے بعد کی تفصیل غیر ضروری ہے۔ اس ذخیرہ کا ایک معتدبہ حصہ پہلے سریانی میں پھر پہلوی میں اور عربی میں منتقل ہوا لیکن چوتھی صدی میں جب فارابی اور ابو بشر متی کا زمانہ آیا تو یونانی کتابیں بھی عربی میں ترجمہ ہوئیں۔

لیکن شیخ بو علی سینا کے زمانہ تک منطق کا نصاب انہیں نو کتابوں کی تعلیم پر مشتمل تھا۔ شیخ نے ان کتابوں کے مضامین کو کتاب الشفاء کے حصہ منطق میں بیان کیا پھر اسی کا خلاصہ "کتاب النجاۃ" میں ہے اور یہی کتابیں عرصہ تک منطق کے نصاب کے طور پر استعمال ہوتی رہیں۔

غالباً بعد میں شیخ کی کتابوں کی مدد سے منطق کے اور متون لکھے گئے ان میں سب سے اہم "سراج الارموی" (م ۶۸۲ھ) کی "مطالع الانوار" ہے جس کا پہلا حصہ منطق پر مشتمل ہے۔ (۴۹) پھر ساتویں صدی ہجری کے وسط میں نجم الدین عمر قزوینی کاتبی نے منطق کا ایک متن تحریر لکھ کر صاحب شمس الدین کے نام معنون کیا اس لئے یہ "شمسیہ" کہلایا۔ "شمسیہ" کی

خصوص مطلق، عموم خصوص من وجہ، معرف، حد تام، حد ناقص، رسم تام، رسم ناقص۔

تصدیقات میں۔ حجۃ، قضیہ حملیہ، شرطیہ، موجبہ، سالبہ، موضوع محمول، مخصوصہ، طبعیہ، محصورہ، مہملہ، موجبہ کلیہ، موجبہ جزئیہ، سالبہ کلیہ، سالبہ جزئیہ، محصورات اربعہ، متصلہ، منفصلہ، متصلہ موجبہ، متصلہ سالبہ، منفصلہ موجبہ، منفصلہ سالبہ، مقدم، تالی، لزومیہ، اتفاقیہ، عنادیہ، منفصلہ اتفاقیہ، منفصلہ حقیقیہ، مانعۃ الجمع، مانعۃ الخلو، تناقض، نقیض و احدات ثمانیہ، عکس مستوی، قیاس، اقترانی، استثنائی، اصغر، اکبر، مقدمہ، صغریٰ، کبریٰ، حد اوسط۔

شکل اول، شکل ثانی، شکل ثالث، شکل رابع، استقراء، تمثیل، دلیل لمی، دلیل انی، برہانی، اولیات، فطریات، حدسیات، مشاہدات، تجربیات، متواترات، قیاس جدلی، قیاس خطابی، قیاس شعری، قیاس سفسطی"

یہ اجمال ایک تفصیل کی مقتضی ہے جس کے زیر نظر کتاب کے اندرون صفحات کا مطالعہ ضروری ہے۔

کتاب اور صاحب کتاب سے متعلق جو اجمالی اشارے راقم السطور نے اوپر پیش کئے اس سے اس متن متین کی قیمت اور اہمیت کا اندازہ ہو گیا ہوگا۔ اس زمانے میں جب کہ ہمتوں کی سستی کی وجہ سے منطق و معقولات کی طرف سے بے توجہی بڑھتی جا رہی ہے ضرورت تھی کہ اس در شاہوار کو اردو داں طبقہ کے اندر متعارف کرایا جاتا ہر چند کہ یہ فریضہ پچھلے شارحین و مترجمین ادا کر چکے ہیں۔ لیکن:

مشاطہ را بگو کہ بر دوئے حسن یار
چیزے فزوں کند کہ تماشا بکار سید

تعلیقات وحواشی

۱۔ حسن روملو : احسن التواریخ ص ل تہران ۱۳۴۲ھ
۲۔ امام الدین ریاضی : تذکرہ باغستان ورق ۶۷۴ ظ مخطوطہ کتب خانہ لکھنؤ یونیورسٹی
۳۔ امام الدین ریاضی : تذکرہ باغستان ، ورق ۶۷۴ ظ
۴۔ ابن حجر۔ الدرر الکامنہ (۶ : ۱۰۰) حیدرآباد ۱۳۹۶ھ
۵۔ امام الدین ریاضی۔ تذکرہ باغستان ورق ۶۸۰ ظ
۶۔ آزاد بلگرامی : ماثر الکرام ۲۳۶ حیدرآباد ۱۹۱۳ء
۷۔ امام الدین ریاضی : تذکرہ باغستان ورق ۶۸۰ ب
۸۔ ملا عبدالحمید لاہوری : بادشاہ نامہ (۲ : ۳۴۰) کلکتہ ۱۸۶۷ء
۹۔ شاہ ولی اللہ : انفاس العارفین (ترجمہ) ص ۴ ، دہلی ۱۳۹۳ھ
۱۰۔ عبدالحی : نزہۃ الخواطر (۶ : ۱۴۴)
۱۱۔ شاہ ولی اللہ : رسالہ دانشمندی بحوالہ تذکرہ علمائے ہند ص ۲۵۱
۱۲۔ سرسید احمد خاں : آثار الصنادید ص ۵۱۷ دہلی ۱۹۶۵ء
۱۳۔ آزاد بلگرامی : ماثر الکرام ص ۲۳۶
۱۴۔ محمد رضا انصاری : بانی درس نظامی ص ۴۲ لکھنؤ ۱۹۷۳ء
۱۵۔ محمد رضا انصاری : بانی درس نظامی ص ۴۰
۱۶۔ محمد رضا انصاری : بانی درس نظامی ص ۱۶
۱۷۔ عبدالحی : نزہۃ الخواطر (۶ : ۲۴۳)
۱۸۔ رحمٰن علی : تذکرہ علمائے ہند ص ۲۱۵
۱۹۔ عبدالحی : نزہۃ الخواطر (۷ : ۲۱۳)

۲۰۔ بدایونی۔ منتخب التواریخ (۱: ۳۵) کلکتہ ۱۸۶۸ء
۲۱۔ نجم الحسن رضوی: خیرآباد کی ایک جھلک ص ۸ ۱۹۶۸ء
۲۲۔ نجم الحسن رضوی: خیرآباد کی ایک جھلک ص ۵۰
۲۳۔ حبیب الرحمٰن: تذکرۃ المصنفین ص ۵۵۔ کانپور ۱۳۸۹ھ
۲۴۔ سرسید احمد: آثار الصنادید ص ۵۶۱
۲۵۔ بشیر الدین۔ واقعات دارالحکومت دہلی (۲: ۴۱۴) دہلی ۱۹۱۹ء
۲۶۔ غالب۔ کلیات غالب قطعہ ۵۱ ص ۴۳، کانپور ۱۹۲۰ء
۲۷۔ عبدالحئی: نزہۃ الخواطر (۷: ۲۱۲) حیدرآباد ۱۹۵۹ء
۲۸۔ رحمٰن علی: تذکرہ علمائے ہند ص ۳۳۱ کراچی ۱۹۶۱ء
۲۹۔ گل حسن: تذکرہ غوثیہ ص ۱۹ لاہور ۱۹۶۵ء
۳۰۔ عبدالشاہد۔ باغی ہندوستان ص ۱۴۹ طبع چہارم فیض آباد ۱۹۸۵ء
۳۱۔ سرسید احمد: آثار الصنادید ص ۵۲۶
۳۲۔ سرسید احمد: آثار الصنادید ص ۵۶۱
۳۳۔ عبدالحئی: نزہۃ الخواطر (۷: ۲۷۴)
۳۴۔ نجم الحسن رضوی: خیرآباد کی ایک جھلک ص ۵۰
۳۵۔ بشیر الدین: واقعات دارالحکومت دہلی (۲: ۴۱۴)
۳۶۔ گل حسن: تذکرہ غوثیہ ص ۱۲۴، ۱۲۵، دہلی ۱۹۱۸ء
۳۷۔ رحمٰن علی: تذکرہ علمائے ہند ص ۳۷۶۔
۳۸۔ رحمٰن علی: تذکرہ علمائے ہند ص ۳۷۶
۳۹۔ بشیر الدین: واقعات دارالحکومت دہلی (۲: ۴۱۴)
۴۰۔ نجم الحسن رضوی: خیرآباد کی ایک جھلک ص ۵۰

۴۱۔ بشیرالدین۔ واقعات دارالحکومت دہلی (۲: ۴۱۴)

۴۲۔ اسلام اور عصر جدید، ص ۳۰ اکتوبر ۱۹۸۶ء

۴۳۔ گل حسن : تذکرہ غوثیہ ص ۱۹ لاہور ۱۹۵۹ء

۴۴۔ عبدالشاہد : باغی ہندوستان ص ۱۳۸۔

۴۵۔ اسلام اور عصر جدید۔ ص ۳۶

۴۶۔ حبیب الرحمن۔ تذکرۃ المصنفین۔ ص ۵۵۔

۴۷۔ عبدالحی۔ نزہۃ الخواطر (۷ : ۳۷۴)

۴۸۔ حاجی خلیفہ ، کشف الظنون (۱: ۲۰۶) مطبعۃ البہیہ ۱۹۴۳ء

۴۹۔ حاجی خلیفہ ، کشف الظنون (۲ : ۱۵۱۷)

۵۰ قفطی : تاریخ الحکماء ص ۴۵۷ لیپزنگ ۱۹۰۳ء

۵۱۔ ایک محقق نے لکھا ہے کہ ایسا غوجی کی یا بجستوٗ شرحیں لکھی گئیں واللہ اعلم

۵۲ فضل امام ، مرقات ص ۳۲۔

۵۳۔ فضل امام : مرقات۔ ص ۳۲۔

(ختم شد)

عبدالرزاق کرد علی

(۱۸۷۶ء ــــ ۱۹۵۳ء)

فیضان احمد، شعبۂ عربی، علی گڑھ۔

کرد علی دورِ حاضر کے ایک ممتاز ادیب، صحافی، مورخ اور محقق ہیں۔ وہ طاہر جزائری کے شاگرد رشید اور ان کے خیالات و نظریات کے وارث اور ترجمان ہیں۔ انہوں نے ادب اور تاریخ کے علاوہ بے شمار موضوعات پر مقالات اور کتابیں لکھیں جو اپنی وسعت، ہمہ گیری اور جامعیت میں اپنی مثال آپ ہیں۔

ان کی شخصیت کی سب سے زیادہ زندہ اور تابندہ یادگار دمشق کی عظیم علمی اکیڈمی "المجمع العلمی العربی" اور اس کا آرگن ہے جو کرد علی کی زیر نگرانی ترقی اور عظمت کے عظیم مقام پر فائز ہوا۔ کرد علی نے اس اکیڈمی کو ہر طرح کے سیاسی اغراض و مقاصد اور ذاتی مفاد و منفعت سے بالا رکھا، اس اکیڈمی کے ذریعہ انہوں نے دمشق میں جدید عربی ادب کی بنیاد رکھی اور اس کو مستحکم بھی کیا۔ کرد علی نے اپنی کتابوں کے ذریعہ عربی زبان میں تحقیق و ریسرچ کی وہ اعلیٰ بنیاد فراہم کی جو مغربی دنیا میں متعارف ہے ان کی کتاب "خطط الشام" اس کا اعلیٰ شاہکار ہے۔

خاندان ــــ تعلیم و تربیت:۔

کرد علی اپنے خاندان کے متعلق لکھتے ہیں "میرے خاندان کا تعلق عراق کے مشہور شہر سلیمانیہ سے ہے، اس شہر میں زیادہ تر کرد آباد ہو گئے تھے، میرے دادا عراق سے شام کے شہر دمشق منتقل ہو گئے تھے جن کا پیشہ تجارت تھا اور انہوں نے کافی جائیداد پیدا کر لی تھی۔ ان کا شمار شہر کے سربرآوردہ لوگوں میں ہونے لگا۔ کرد علی کے دادا عزیمت و غیرت اور شجاعت و بے باکی میں مشہور تھے، ایک مرتبہ وہ تجارت کی غرض سے حجاز گئے وہاں انہوں نے "محافظ امور حج" کے بعض معاملات پر تنقید کی اس پر وہ بہت خفا ہوا، وہ اپنے ظلم و ستم کی وجہ سے مشہور تھا، اس لئے اس نے ان کی املاک کی ضبطی کا فوراً حکم صادر کر دیا۔ اس کارروائی کے بعد وہ آستانہ فریاد لے کر پہونچے، مختلف پریشانیوں کے بعد وسیلوں کے ذریعہ سلطان کے دربار میں پیش ہونے کا موقع ملا، سلطان نے بجائے اس کے کہ محافظ امور حج کی گرفت کرے ان سے کہا کہ آپ اپنے دعوی اور مقدمہ سے دستبردار ہو جائیں، اور اس کے بدلے شام میں دو گاؤں لے لیں اور اس سے اپنا اور اپنے بچوں کا رزق حاصل کریں۔ اس پر ان کے دادا نے کہا میں آپ کے پاس خیرات لینے نہیں آیا ہوں بلکہ ظلم کے خلاف فریاد کرنے آیا ہوں اور انصاف کا طلبگار ہوں۔ یہ کہہ کر وہ دمشق فقیری اور غریبی کی حالت میں واپس آ گئے اور کچھ دنوں کے بعد انتقال کر گئے۔ اس طرح کرد علی کے والد کو وراثت میں فقیری اور مسکینی ملی، لیکن انہوں نے ہمت نہیں ہاری بلکہ غایت درجہ محنت و مشقت سے پہلے سلائی کا کام کیا اور پھر تجارت، تجارت میں بارہا نقصان اور فائدے ہوتے رہے، آخر میں انہوں نے غوطہ میں ایک فارم خرید لیا جو ہمارے خاندان کا ذریعہ معاش بنا۔[2]

---

[1] خطط الشام ج ۶، کرد علی ص ۴۱۱

[2] خطط الشام ج ۶، کرد علی، ص ۴۱۱۔